ڈاکٹر محمد اسلم رانا کے اُردو افسانے

ڈاکٹر ثوبیہ اسلم

Dr. Sobia Aslam

Abstract:

Dr. Muhammad Aslam Rana was a teacher of Punjabi language and literature.His served as chairman of punjabi department in oriental college punjab university Lahore.He was a great scholar and well read personality.Though he was mainly known for his research work and editing of both punjabi and urdu books,he also contributed to different urdu and punjabi papers.His contributions are highly esteemed with the special reference of short stories,poetry,drama,researches and also critique.

In his short stories he always pointed out the depressed people of the society in a befitting manners.He touched the pulse of the society through these short stories and added his voice in alarming situation of the social injustice prevailed in the society and he given the solution to solve them by the each individual of the society.These short stories already published in various digests,periodicals of the country.

Although Dr. Muhammad Aslam Rana (Late) was a versatile genius in Punjabi language and literature. But his short stories equally contributes in punjabi and urdu fiction as well. He did his experiment in Urdu short story specially we are discussing here with the special reference of his contribution.

شعبہ پنجابی، اورئینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی کے ہر دلعزیز استاد، شاعر، نقاد، محقق، سوجھوان، نثر نگار، مرتب، مدوّن، شارع ڈاکٹر اسلم رانا قطبی والا، تحصیل نکودر، ضلع جالندھر میں ۱۸/اگست ۱۹۴۱ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد صاحب رانا خیرات اللہ اس وقت کے میٹرک پاس تھے اور تقسیم ہند سے پہلے محکمہ مال میں پٹواری تھے۔ آپ کی والدہ کا نام رشیدہ بیگم تھا۔ خیرات اللہ کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ پنجابی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

بیٹیاں رفیقہ بیگم اور صدیقہ بیگم، جن میں سے رفیقہ بیگم گگومنڈی ضلع وہاڑی رہتی ہیں۔ جب کہ صدیقہ بیگم راولپنڈی میں رہتی ہیں۔ اسلم رانا راجپوتوں کی پنوار گوت سے تعلق رکھتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ خاندان ہجرت کر کے چک نمبر 365/EB ضلع وہاڑی کی تحصیل بوریوالہ میں آ کر آباد ہوئے جہاں انہیں کچھ زمین الاٹ ہوئی اور ان کے والد کو کوٹ قبولہ نزد عارف والہ میں پٹواری کی نوکری بھی مل گئی۔ ڈاکٹر اسلم رانا نے ۱۹۶۱ء میں فاضل پنجابی کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۷۵ء میں ایم اے پنجابی اور ۱۹۷۸ء میں ایل ایل۔ بی کے امتحانات پاس کیئے۔ ۱۹۷۰-۱۹۷۱ء کے قریب ان کے کالم ''لاہوریات'' کے عنوان سے ''نصرت'' اور ''مساوات'' میں چھپتے رہے جب مساوات کے مدیر حنیف رامے تھے۔ جن کے پاس اسلم رانا بلا معاوضہ کام کرتے تھے۔ لگ بھگ تیرہ سال تک ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلیویژن پر کئی ادبی پروگرام کیئے۔ ڈاکٹر اسلم رانا نے اپنی تھوڑی زندگی میں ایک دنیا دیکھی تھی۔ آپ بلغاریہ، جرمنی، ترکی، ایران، یورپ اور افغانستان گئے۔ آپ نے زندگی میں بڑا مشکل وقت گزارا جس کی نشاندہی ان کے افسانوں اور دیگر تخلیقی ادب میں بھی جا بجا نظر آتی ہے۔ اپنے استاد اور ساتھی شریف کنجاہی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''میں نے زندگی میں بہت دکھ اٹھائے۔ بچپن ہی سے کرب کے سمندر میں دھکیل دیا گیا اور پھر زندگی اور معاشرے نے فٹ بال کی طرح اپنے پاؤں کے آگے رکھ لیا اور آج تک جب اس کی ٹاکیاں اور ٹانکے اکھڑ گئے ہیں ابھی تک زمانے کی ٹھوکروں کی زد میں ہوں۔''

ڈاکٹر اسلم رانا نے اپنی زندگی کے پچپن سال رنج والم میں گزارے اور ۲۱ جون ۱۹۹۶ء میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اردو ادب کے علاوہ پنجابی ادب میں بھی ان کا کام بہت ہے جن میں پنجابی، اردو شاعری، تنقید، ترتیب و تدوین، مرتب، نظر ثانی، کتابوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ (۱)

بنیادی طور پر افسانہ قصے کی ایک شکل ہے۔ قصہ بھی وہ جس میں بنیادی چیز قصہ پن ہونا چاہیے۔ افسانے کی بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں فکر اور کہانی دونوں کا ربط اس طرح ہو جس طرح روح اور جسم کا ہوتا ہے۔ اس کی بہترین مثال ٹالسٹائی کی آفاقی کہانیاں ہو سکتی ہیں یا موپساں جیسے کہانی کار کی کہانیاں جن میں تخیلی تخلیق کی چمک ہمیں نظر آ جاتی ہے۔ (۲)

اگر افسانے کی روایت پر ایک نظر ڈالیں تو فکر اور افسانہ باہم پیوست ہوتے ہیں۔ ایک اچھے افسانے کے بنیادی فقرے قاری کی ساری توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتے ہیں۔ افسانے کے فن کا کمال یہی ہے کہ شروع سے ہی افسانے کا واقعہ اور قصے کی اصل شکل اور افسانہ نگار کے نظریات کا ہمیں علم ہو جاتا ہے۔ قاری کی ساری دلچسپی افسانے کے ساتھ بن جاتی ہے۔ عالمی ادب میں ایسے افسانہ نگاروں کی کمی نہیں ہے۔ ان میں جو پہلا نام ہمارے سامنے آتا ہے امریکہ کے ایڈگر ایلن پو کا ہے جنھوں نے کہانی کو

فنی، آفاقی اور دائمی قدروں کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا ہے۔ ایلن پو کے ساتھ امریکہ میں ہاتھورن، اوہنری، روس میں چیخوف، گورکی، ٹالسٹائی، فرانس میں موپساں، انگلستان میں کیتھرائن منسفیلڈ بلاشبہ کہانی کی دنیا میں بڑے نام ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ نام مثلاً دستو ئسکی، ترگینو، بالزاک تھیکرے، ہارڈی، ہربرٹ، جارج ولز، ٹامس، کافکا، جیمس جائس، ڈی ایچ لارنس، ارنسٹ ہیمنگوے، فالکنز وغیرہ جن کی کہانیاں عالمی معیار کی ہیں۔ یہ لوگ صرف افسانہ نگار کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ناول نگار کی حیثیت سے بھی مشہور ہوئے۔ ان میں سے بعض شاعر اور مضمون نگار بھی تھے۔ بہر حال افسانہ یا قصہ گوئی کا کمال یہ ہے کہ واقعہ کو اس طرح بیان کیا جائے کہ قاری تجسس اور وحدت تاثر کے جال میں پھنس کر آگے کیا ہوگا؟ کا مکمل سوال بن جائے۔ دل کی ہر دھڑکن لفظ لفظ اور جملے جملے میں بولتی ہوئی نظر آئے۔ (۳)

اگر ہم دیکھیں تو اُردو افسانے کے ابتدائی دور، جو کرشن چندر، بیدی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، خواجہ احمد عباس، مجنوں گورکھ پوری، سجاد حیدر یلدرم، جوگندر پال اور ممتاز مفتی جیسے بے شمار اہم ناموں سے وابستہ ہے، اس دور میں تو ابلاغ کبھی مسئلہ نہیں رہا۔ یہ تمام لکھنے والے اور ان جیسے دوسرے سینئر ادیب جو آج تک ادب کے اہم ستون ہیں، بیانیہ کہانیاں لکھتے تھے اور جن کا ابلاغ مکمل طور پہ قاری پر ہوتا تھا۔ اس دور کی ان سب کی لکھی ہوئی تحریریں ہنوز معیاری و معتبر ادب میں شامل ہیں۔ اور اب بھی ہمارے یہاں منشاء یاد، خالدہ حسین، احمد ندیم قاسمی، عذرا اصغر، شوکت حیات، یونس جاوید، فہمیدہ ریاض اور زاہدہ حنا جیسے لکھنے والے اہم اور مقبول ہیں جن کی کہانیوں میں بھرپور ابلاغ سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ افسانے میں بنیادی خیال، تجربہ، مشاہدہ اور مطالعے کے ساتھ کامیاب جزئیات نگاری اسے مقبول و معتبر بناتی ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ کہانی پن ایک کامیاب افسانے کی ضمانت ماضی میں بھی رہی ہے، حال میں بھی ہے اور مستقبل میں بھی رہے گی۔ (۴)

کہانی کار کی سب سے بڑی قوت اس کا تخیل ہے اور فلسفی کی سب سے بڑی قوت بحث۔ لیکن اس کے باوجود ایک بڑا کہانی کار بڑا فلسفی بھی ہوتا ہے جو تخیل اور تصورات کی مدد سے زندگی کے اصولوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ کہانی نویس کے مفکر ہونے کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ وہ کسی سیاسی، ادبی یا نفسیاتی نظریے کا پرچارک بن جائے کیونکہ ایسی صورت میں کہانی کار کی فکر یک طرفہ ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ اس کا طریق کار تخیلی کی بجائے ذہنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس ساری بحث کا مطلب یہ ہے کہ عالمی ادب کے حوالے سے افسانے کی اُونچ کو سمجھا جا سکے تاکہ اس کی روشنی میں اردو افسانے بالخصوص ڈاکٹر اسلم رانا جو افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ محقق، نقاد، شاعر، تدوین کار، مرتب بھی ہیں۔

اس مضمون میں محمد اسلم رانا کی اردو افسانہ نگاری کے بارے میں لکھا جائے گا۔ ڈاکٹر اسلم رانا ماہنامہ ''سلام عرض''، لاہور کے اجراء کے موقع پر ایڈیٹر کے نام خط پر لکھتے ہیں:

''محترم تبسم صاحب............

سلام عرض کا اجرا بلاشبہ ایک مستحسن اقدام ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ جب کہ اس قسم کے ایک پرچے کی اشد ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ حقائق نگار کی حیثیت سے میرا نام معروف قلمکاروں میں نہیں آتا تاہم میرا قلم قطعی نو آموز قلم کار کا قلم نہیں۔ ڈائریکٹر اور دیگر فلمی رسائل کے قارئین میرے قلم کو پہچانتے ہیں اور اب میرا ارادہ ہے کہ قلم سے حقائق کی قندیلیں جلا کر ''سلام عرض کے اوراق کو اپنے ذہن کی رعنائیاں لٹاؤں۔ ''لمحوں کی دھول'' پر آپ کی رائے موصول ہوتے ہی نئی کہانی بھجوا دوں گا۔ ''لمحوں کی دھول'' بظاہر ایک ناقابل یقین حقیقت ہے مگر ہم اپنے معاشرے میں اخلاقی انحطاط کو بنظر غائر دیکھیں تو یہ حادثہ ناقابل یقین بھی نہیں۔ انسان نے اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے سے ستاروں پر کمندیں ڈالیں۔ فضاؤں کا سینہ چیر کر ماہتاب کی ٹھنڈی کرنوں کو تسخیر کیا۔ اس نے ترقی کی راہوں میں نت نئی منزلیں طے کیں۔ مگر انسان...... اشرف المخلوقات...... آج تک کوئی ایسا پیمانہ نہ بنا سکا جس سے وہ اپنے انسانی رشتوں کی تمیز کر سکتا...... کون...... اس کا...... کیا ہے...... یہ جان سکتا!

اس کہانی کا مرکزی کردار ابھی تک بقید حیات ہے اور یہ کہانی مجھ تک اس کی زبانی پہنچی۔ وہ آج بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے میں مصروف ہے۔ میں نے کہانی کو ایک عام فہم انداز میں صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا ہے تاہم اس کے کرداروں کے اصلی نام بدل دیئے ہیں کیونکہ اعتراف گناہ اور اظہار پشیمانی کے باوجود انسان فطرتاً اپنے کردار سے متعلق تاریک پہلوؤں کو پس پردہ رکھنے کا خواہاں ہے۔

کہانی پر آپ کی اور قارئین کی آراء کا شدت سے منتظر رہوں گا۔

خلوص کار

اسلم رانا، کمرہ نمبر ۲، سراج بلڈنگ، کرشن نگر، لاہور''(۵)

مذکورہ بالا خط سے ڈاکٹر اسلم رانا کا تخیل، معاشرتی، اخلاقی کا انحطاط، انسانی کوشش، تسخیر کائنات، انسانی رشتوں کی تمیز، پچھتاوا اور انسانیت کے دیگر پیمانوں کے بارے ان کے خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر اسلم رانا کے اردو اور پنجابی افسانے جو اپنے وقت کے مؤقر جریدوں میں شائع ہوتے رہے ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

اُردو افسانے

سرخ پانی، (۶) پڑوسی، (۷) خوشی کی تلاش، (۸) کسان اور کلرک، (۹) وطن کی بیٹی، (۱۰) پرچم، (۱۱) وقت کی دھول (مخطوطہ)، افسانہ وحشت و بربریت (۱۲)

پنجابی افسانے

اُردو افسانوں کے علاوہ موصوف نے پنجابی افسانہ نویسی میں بھی کمال حاصل کیا۔ ان کے معروف پنجابی افسانوں میں:

پنجابی افسانہ ''اَن پانی'' (مخطوطہ)، فرانسیسی کہانی ''جھنڈا'' (ترجمہ)،[۱۳] ''ستمبر کی بیٹی''[۱۴] پنجابی افسانہ ''آخری دعا'' (مخطوطہ)، انشائیہ ''میں تے میں'' (مخطوطہ)، پنجابی کہانی ''بھکھاں دے ڈنگ'' (مخطوطہ)، پنجابی کہانی، ''رتا پانی'' (مخطوطہ)، ''بھڑولا'' (مخطوطہ)، جو ۱۹۷۴۔۰۹۔۱ پنجابی ادبی سنگت میں پڑھی گیا۔ پنجابی کہانی ''سوچاں دے پھُل'' (مخطوطہ)، کہانی، ''بلاعنوان'' (مخطوطہ)، ''لمحوں کی دھول''[۱۵] ٹائپ شدہ افسانہ، ''شاہکار''، ''نویاں گونجاں'' (مخطوطہ)، ''میں کون؟'' (مخطوطہ)۔

سرخ پانی

اس افسانے میں معاشرتی ناانصافی، پژمردگی، عام آدمی کا استحصال، طبقاتی تقسیم، غربت، عیال داری کی جھلک بدرجہ اُتم موجود ہے۔ افسانے کے شروع میں منظر نگاری خوب کی گئی ہے۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء کی دہائی کے تقریباً ہر گھر کی کہانی ہے۔ جس میں انسانیت کی تذلیل اور طاقت ور کا زور نظر آتا ہے۔ بشیرے کے کردار میں مصنف خود بول رہا ہے اور معاشرے سے ناانصافی اور غربت کے خاتمے کا متمنی ہے۔ افسانے میں بتایا گیا ہے کہ یہ طاقت ور لوگوں کی دنیا ہے جو غرباء کو کیڑے مکوڑے سمجھتے ہیں۔ عام کسانوں کا دوہرا استحصال کیا جاتا ہے۔ ایک طرف تو ان کے نام مزدوروں کی فہرست میں ڈال کر اُن سے دستخط لے لئے جاتے ہیں اور مزدوری کے پیسے خود کھائے جاتے ہیں۔ جب کہ دوسری طرف نہر میں پانی جاری کرانے کے لئے ان سے چندہ بھی طلب کیا جاتا ہے۔ یعنی گاؤں کے ہر اَن پڑھ کو اپنے جاہل ہونے کی قیمت دینا پڑتی ہے اور بشیرے جیسے راست گو کو اپنے خون کی پانی میں آمیزش کر کے نہر کو رواں کرنا پڑتا ہے۔ طاقت ور معاشرتی ناہمواری بشیرے کی جان لے لیتی ہے۔ راجباہ میں جب پانی آتا ہے تو اس میں بشیرے کی خون کی آمیزش بھی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر اسلم رانا نے یہ افسانہ یوں لکھا ہے کہ اس پر حقیقت کا گماں گزرتا ہے۔ تقریباً ہمارے ہر گاؤں میں غریبوں کا دُہرا استیصال کیا جا رہا ہے اور بشیرے جیسے کئی اور لوگ اس ناہمواری کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ طاقت ور اور طاقت ور ہوتا جا رہا ہے۔ ایک طرف وہ حکومت میں بیٹھ کر لوٹتا ہے، دوسری طرف غریبوں سے چندے کی صورت میں اُن کی کمائی بھی چھین لیتا ہے۔

وطن کی بیٹی

یہ افسانہ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے دور میں لکھا گیا۔ جس میں حزن وملال، پژمردگی، خیرو، عورت کی

کمزوری اور ہوس پرستی کی داستان ہے جس میں دینو اور منشی لالچی اور موقع پرست ہیں جو جانو سے اس کی محنت کی اُجرت کی بجائے اس کی طرف میلی نگاہ سے بھی دیکھتے تھے۔ جانو کا بھائی جیل میں تھا اور جانو اکلاپے کا شکار تھی۔ ایسی صورت میں منیجر نے جانو سے ہمدردی کا رشتہ بنالیا اور اس سے شادی رچالی لیکن وہ منیجر دشمن کا جاسوس تھا۔ جس کا پتہ ایک دن جانو کو چل گیا اور اس نے پاکستانی سپاہیوں کو اس کے بارے میں بتادیا۔ اس طرح وطن سے محبت کے رشتے نے ازدواجی رشتے کو مات دے دی اور جانو وطن کی بیٹی کے طور پر سامنے آئی۔

پڑوسی

ڈاکٹر اسلم رانا کے دوسرے افسانوں کی طرح پڑوسی میں بھی منظر نگاری خوب کی گئی ہے۔ اس افسانے میں عورت کی بے مروّتی، پیار کے رشتوں کے ناموس کی تباہی کی کہانی پیش کی گئی ہے۔

لمحوں کی دھول

یہ افسانہ اُردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں لکھا گیا ہے۔ جس میں روایات، رشتے، اجنبی پر اعتبار، رشتوں کا تقدس، بانو کی شناخت، گاموں مزارع کی بیٹی سروری جس کی اٹھتی جوانی ہوس پرستوں کے لئے کشش رکھتی تھی۔ سلیم سروری کی عزت سے کھیلتا رہا اور جیسا کہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہ کبھی لگا ہے اور نہ لگے گا۔ سروری کو جب سلیم نے عزت کا کوئی رشتہ نہ دیا تو وہ دنیا کی ہوس پرستی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ ہر کوئی اس کی جوانی کا بھوکا تھا جیسے سلیم جو سروری کو برباد کرنے کے بعد بھی باز نہ آیا اور ہر روز نئی لڑکی کے چکر میں رہتا تھا۔ ''چاہ کن راچاہ درپیش'' کے مصداق سلیم جس کے گھر سروری کی بیٹی نجمہ کام کے لئے آئی تو سلیم اس پر بھی ڈورے ڈالنے سے باز نہ آیا اور اس کی عزت سے بھی کھیلتا رہا۔ حتیٰ کہ نجمہ نے بھی ایک بچی کو جنم دیا جس کا نام بانو جو آج بھی اپنے رشتے کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ قدرت نے سلیم کو اس کے گناہ کا وہ انت دکھایا جس کا کوئی انسان تصور بھی نہیں کرسکتا۔

وحشت وبربریت

یہ کہانی حقیقت پر مبنی ہے جو ماہنامہ آداب عرض کے لئے لکھی گئی۔ اس وقت اسلم رانا سراج بلڈنگ کرشن نگر کمرہ نمبر ۲ لاہور میں رہائش پذیر تھے۔ اس افسانے میں ۱۹۴۷ء کے دلخراش واقعات کی جھلک ملتی ہے۔ اسلم رانا کے بچپن کے واقعات ہیں جب وہ ہندوستان سے ہجرت کرکے پاکستان آئے۔ ان کے قافلے کے سالار مہدی خان نے میر جعفر کا کردار ادا کیا اور سکھوں سے رقم لے کر قافلے کو سکھوں کے حوالے کردیا۔ اس ہجرت میں ڈاکٹر اسلم رانا نے قدم قدم پر موت کا سامنا کرتے ہوئے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا۔ یہ کہانی سکھوں کی بربریت اور ظلم کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ آج جب ڈاکٹر اسلم رانا سکھوں کی آؤ بھگت اس ملک میں دیکھتا ہے تو اس کا خون کھول اٹھتا ہے اور وہ اندر ہی اندر پیچ و

تاب کھاتا ہوا سوچتا ہے کہ یہ وہی سکھ ہیں جنھوں نے مسلمانوں کی بہو بیٹیوں کے آنچل نوچے، عزتیں داغ دار کر کے قتل کیا اور یہ وہی مسلمان ہیں جن کے عزیز و اقارب کی عزتیں ان سکھوں کے ہاتھوں پامال ہوئیں۔ آج اس دھرتی پر ان کی مہمان نوازی کسی طرح بھی زیب نہیں دیتی۔

ستمبر کی بیٹی

یہ کہانی پہلے وطن کی بیٹی کے عنوان سے ہفت روزہ ملت پاک لاہور میں یکم جنوری ۱۹۷۱ء میں چھپ چکی ہے۔

خوشی کی تلاش میں

اس افسانے میں ایک خالی پیٹ انسان کی سوچیں، رشوت، سفارش، غربت کی ایک داستان ہے۔ حامد جس کی بہن ٹی بی کی مریضہ ہے اور حامد دن بھر نوکری کی تلاش میں دھکے کھاتا ہے مگر سفارش اور رشوت اس کو کہیں ملازم نہیں ہونے دیتی مگر ایک مجبور بھائی کی بہن کو اس تسلی میں سب کچھ واضح ہو جاتا ہے، ''سو جاؤ اس امید پر کہ شاید آنے والی کل ہماری زندگی میں خوشی بن کر آئے۔ دیا بجھا دو کیونکہ اندھیرا اپنے اندر بہت کچھ چھپا لیتا ہے۔''

کسان اور کلرک

اس افسانے کے شروع میں ڈاکٹر اسلم رانا نے اپنی روایت کے مطابق خوب منظر نگاری کی ہے۔ گاؤں کے زمیندار تعلیم کے دشمن ہیں اور اپنے گاؤں میں سکول بنانے کے مخالف ہیں تاکہ مزارع پڑھ نہ سکیں۔ یہ معاشی ناہمواریوں اور غریب کے استحصال اور سرمایہ دارانہ نظام کی ایک جھلک ہے جس میں غریب کا خون نچوڑنا عام سی بات ہے اور مشین نے انسان کو کس طرح بے روزگار کیا۔ رشید ایک مزارع کرم دین کا بیٹا ہے جس کو شہر میں کلرک کی نوکری مل جاتی ہے اور اس کا باپ زمیندار کی زمینیں کاشت کرتا ہے اور اس کو بٹائی میں اس کا پورا حصہ بھی نہیں ملتا۔ مزارع کا بیٹا زمیندار کے بیٹے سے حساب کتاب کرتا ہے تو زمیندار اپنی کھیتوں کی کاشت کے لئے ٹریکٹر خرید لیتا ہے اور مزارع کو فارغ کر دیتا ہے۔ دوسری طرف ٹائپ رائٹر کے آنے مزارع کا بیٹا بھی اپنی نوکری سے فارغ ہو جاتا ہے۔ اس طرح مشینوں کی آمد نے اس گھر کو تباہ و برباد کر دیا۔ ڈاکٹر اسلم رانا نے پنجابی میں بھی افسانے لکھے۔ زمانے کی ناقدری، رشوت، سفارش، امیروں کے ہاتھوں غریبوں کا استحصال، معاشرتی ناہمواریوں میں سے ڈاکٹر اسلم رانا خود گزرے حتیٰ کہ قیام پاکستان کے وقت انڈیا سے پاکستان ہجرت کے دوران وحشت و بربریت کا سامنا بھی کیا۔ ڈاکٹر اسلم رانا پینڈو رہتل سے کبھی باہر نہیں نکلے۔ گاؤں کی زندگی سے ان کو ایک خاص اُنس ہے۔ ان کے ہر افسانے میں شہری واقعات کم جب کہ گاؤں کے واقعات زیادہ ہیں۔ موصوف نے زندگی کی تلخیوں کو ہمیشہ اپنے قرب میں محسوس کیا جس کی مثال شریف کنجاہی کے نام ان کے اس خط سے ہوتی ہے۔

’’میں نے زندگی میں بہت دکھ اٹھائے۔ بچپن ہی سے کرب کے سمندر میں دھکیل دیا گیا اور پھر زندگی اور معاشرے نے فٹ بال کی طرح اپنے پاؤں کے آگے رکھ لیا اور آج تک اس کی ٹاکیاں اور ٹانکے اُکھڑ گئے ہیں۔ ابھی تک زمانے کی ٹھوکروں کی زد میں ہوں۔‘‘

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر عصمت اللہ زاہد، ثوبیہ اسلم، درد کی چھاؤں میرا گاؤں، (اُردو مجموعہ شاعری) از ڈاکٹر اسلم رانا، اوری اینٹل کالج میگزین، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، جلد ۹۰، شمارہ ۲، مسلسل شمارہ ۳۳۶، اپریل ۔جون ۲۰۱۵ء، ص ۸۵۔ ۸۴

۲۔ سید مسعود ہاشمی، آفاقی زندگی دا کہانی کار، لہراں (ماہنامہ)، ایڈیٹر: سید اختر حسین اختر، شمارہ نمبر ۸، اگست ۱۹۸۳ء، لاہور، ص ۳۱

۳۔ ثوبیہ اسلم، ہانی پنج دریاواں دا، تکمیل پبلشرز رائل پارک، لاہور، جولائی ۲۰۱۴ ص ۸۵۔ ۸۴

۴۔ شکیلہ رفیق، افسانے میں ابلاغ اور رُنت کی اہمیت، تخلیق (ماہنامہ)، ایڈیٹر: اظہر جاوید، جلد نمبر ۳۷، شمارہ نمبر ۱۰، اکتوبر ۲۰۰۶ء، لاہور، ص ۲۱

۵۔ اسلم رانا، ایڈیٹر کے نام خط، سلام عرض (ماہنامہ)، دسمبر ۱۹۷۰ء، ص ۴۹

۶۔ ایم اسلم رانا، اردو افسانہ سرخ پانی، ڈائریکٹر (ماہنامہ)، لاہور، اگست ۱۹۶۹ء، ص ۶۸۔ ۶۵

۷۔ محمد اسلم رانا، اردو افسانہ پڑوسی، ڈائریکٹر (ماہنامہ)، لاہور، اگست ۱۹۶۹ء، ص ۷۹۔ ۷۵

۸۔ محمد اسلم رانا، اردو افسانہ خوشی کی تلاش میں، ڈائریکٹر (ماہنامہ)، لاہور، مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۸۷۔ ۸۵

۹۔ محمد اسلم رانا، اردو افسانہ کسان اور کلرک، ڈائریکٹر (ماہنامہ)، لاہور، اکتوبر ۱۹۶۹ء، ص ۷۰۔ ۵۷

۱۰۔ محمد اسلم رانا، اردو افسانہ وطن کی بیٹی، ملت پاک (ہفت روزہ)، لاہور، یکم جنوری، ۱۹۷۱ء، ص ۱۹۔ ۱۵

۱۱۔ محمد اسلم رانا، اردو افسانہ پرچم، امروز (ہفت روزہ اشاعت)، ۱۳/ اپریل ۱۹۶۹ء، ص ۶

۱۲۔ محمد اسلم رانا، افسانہ وحشت و بربریت، آداب عرض (ماہنامہ)، لاہور، اگست ۱۹۷۰ء، ص ۱۱۰۔ ۱۰۱

۱۳۔ لوئیس ہیلگر، اسلم رانا (مترجم)، فرانسیسی کہانی جھنڈا (پنجابی ترجمہ)، امروز (ہفت روزہ اشاعت)، ۱۶ اپریل ۱۹۷۹ء، ص ۴

۱۴۔ اسلم رانا، افسانہ ستمبر کی بیٹی، ڈائجسٹ، فیصل آباد، اکتوبر ۱۹۷۲ء، ص ۶۴۔ ۴۷

۱۵۔ ایڈیٹر، سلام عرض ہو (ماہنامہ)، ایک خط بتاریخ ماہ